تحریکِ اسلامی کا عام کارکن

خرم مرادؒ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تحریک اسلامی کا عام کارکن

ہماری آج کی ضرورت یہ ہے کہ ہم اس بات پر غور کریں کہ ہم تحریکِ اسلامی کے عام کارکن کیسے بن سکتے ہیں؟ یہ ہماری عملی ضرورت ہے۔ میں نے اس میں 'مثالی' کا لفظ ہٹا کر 'عام' کا اضافہ بھی کر دیا ہے۔ یہ بھی ایک جسارت ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ مثالی کارکن کا نقشہ کھینچنا کچھ مشکل نہیں، لیکن مثالی کارکن کا نقشہ کھینچنے میں عموماً ایک کمزوری یہ واقع ہو جاتی ہے کہ ہم اس کو سنتے بھی ہیں، سر بھی دھنتے ہیں، داد و تحسین بھی دیتے ہیں لیکن ہمارے دل میں یہ خیال ہوتا ہے کہ ہم ایسے نہیں بن سکتے۔ جب کہ مثالی، آئیڈیل اور ماڈل ہوتا ہی اس لیے ہے کہ وہ ہماری جستجو اور طلب کے لیے مہمیز کا کام کرے اور ہمارے سامنے اوپر سے اوپر اٹھنے کے لیے ایک معیار پیش کرے۔

کارکن کی اصطلاح

عام کارکن سے مراد وہ کارکن ہے، جسے اگر ہم سمجھ لیں تو ہم میں سے ہر شخص کارکن بن بھی سکتا ہے۔ بلکہ ہم میں بہت سے اس وقت کارکن ہوں گے بھی اور جو نہیں ہیں وہ اس کی کوشش بھی کر سکتے ہیں۔ کارکن کا لفظ بھی اپنی جگہ پر قابلِ غور ہے۔ الفاظ اور اصطلاحات کے ساتھ ایک عجیب معاملہ یہ ہے کہ گردشِ زمانہ کے ساتھ وہ اپنے معنی بدلتے رہتے ہیں اور کبھی کبھی مخالف معنی بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ کارکن کے معنی بڑے واضح اور صاف ہیں۔ کارکن کے معنی کام کرنے والے کے ہوتے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ کام کرنا کسی شخص کی ایک صفت ہے اور یہ صفت کا اظہار ہے۔ اس کی اصل صفات کا اظہار، جن الفاظ سے ہوتا ہے، ان کی تلاش میں اگر ہم تحریک کے اُن سرچشموں کی طرف جائیں، جن کو ہم قرآن و سنت اور اسوۂ نبی کریم ﷺ کے نام سے جانتے ہیں تو وہاں پر ہم مومن، مسلم، مہاجر، متقی، محسن اور مجاہد کے الفاظ پائیں گے۔

ہم نے کارکن کا لفظ کیوں اختیار کیا؟ ہم نے محسوس کیا کہ ایک مزید لفظ کے اضافے کی

ضرورت پڑ گئی ہے۔ اس لیے کہ وہ الفاظ، جو پہلے صفت تھے، مثلاً مومن اور مسلم بھی ایک صفت تھی، وہ اب محض نام بن کر رہ گئے ہیں۔ اب وہ ایک شے اور ایک فرد کا نام بن گئے ہیں اور اپنی صفت سے ان کا رشتہ کٹ چکا ہے۔ لیکن گردشِ زمانہ نے، جو کام مومن اور مسلم کے ساتھ کیا، وہ کام کارکن کے لفظ کے ساتھ بھی ہوسکتا ہے۔ اگر ہم آج اپنی گفتگو میں 'فعال رکن' اور 'غیر فعال کارکن' اور تحریک میں 'جمود' کی بات کریں تو ظاہر ہے یہ دو متضاد الفاظ ہیں، جو ہم ایک اصطلاح میں جمع کریں گے۔ حالاں کہ غیر فعال کارکن اور تحریک میں جمود، یہ دو الفاظ جمع نہیں ہو سکتے۔ کارکن اگر صفت کی بجائے صرف ایک نام بن کر رہ جائے اور تحریک بھی صفت کی بجائے کسی شے کا نام ہو جائے تو پھر یہ ممکن ہے کہ وہ نام اپنی اصل صفات سے دور ہوتے چلے جائیں۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ پہلے ہی قدم پر ہم اس کو اچھی طرح سمجھ لیں اور جان لیں کہ کارکن کسی چیز کا نام نہیں ہے۔ غیر فعال کارکن کی اصطلاح ایک متناقص اور متضاد اصطلاح ہے۔ کارکن تو ہوتا ہی وہ ہے، جو سرتاپا اپنے مقصد میں غرق ہو اور اُس کے لیے کام کر رہا ہو۔ ایسا کارکن جو عام لحاظ سے بھی کارکن کہا جاسکے، خواہ مثالی کارکن نہ ہو، وہ کارکن ہم کیسے بن سکتے ہیں؟

دو اہم تقاضے

ایک عام کارکن بننے کے لیے دو چیزوں کی طرف توجہ ضروری ہے۔ ایک، اپنے قلب کی طرف اور دوسرے، اپنی دعوت کی طرف۔ بات پھیلائی بھی جاسکتی ہے اور اس پر بہت سارے نکات بھی پیش کیے جاسکتے ہیں، لیکن ایک رجحان تعلیم و تربیت کا یہ ہے کہ بات سمیٹ کر اور مختصر کر کے بیان کردی جائے۔ کسی نے نبی کریم ﷺ سے سوال کیا کہ بس مجھے ایک بات بتائیے، جو میرے لیے کافی ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ فَاسْتَقِمْ "کہہ میں اللہ پر ایمان لایا اور اُس پر استقامت کے ساتھ جم جا۔"

بس یہی کافی ہے۔ ایک اور آدمی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا کہ مجھے آپ ﷺ کچھ تعلیم دیجیے۔ آپ ﷺ نے اس کو سورۃ الزلزال پڑھائی اور جب اُس نے آخری آیت پڑھی: فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ○ وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ○ (آیت: ۷،۸) "جو ذرّہ برابر نیکی کرے گا وہ اُس کو بھی دیکھ لے گا اور جو ذرّہ برابر برائی کرے گا وہ اُس کو بھی دیکھ لے

گا'' تو اُس نے کہا کہ بس یہ میرے لیے کافی ہے۔ اس پر حضورﷺ نے فرمایا کہ کسی جنتی کو دیکھنا ہو تو اسے دیکھ لے۔

میرے پیش نظر بھی اختصار ہے۔ کارکن سے متعلق مختصر بات بس اتنی ہے کہ ایک کارکن کی ایک اس کی اپنے اندر کی دنیا ہے اور ایک اس کے باہر کی اور اگر وہ دونوں پر کام شروع کردے تو وہ ایک عام کارکن بن سکتا ہے۔ یہاں اندر کی دنیا سے مراد قلب ہے اور باہر کی دنیا سے مراد دعوت۔

قلب کی طرف توجہ

میں نے قلب کا لفظ استعمال کیا ہے اور قلب کا لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ قرآن مجید کی بڑی بنیادی اصطلاح ہے۔ ہر شخص کی زندگی اور شخصیت کا ایک مرکز ہوتا ہے اور یہ مرکز اس کے اندر واقع ہوتا ہے۔ مرکز وہ ہوتا ہے جہاں انسانی محرکات، جذبات، عزائم، آرزوئیں اور مقاصد اپنا مسکن بناتے ہیں۔ یہی وہ اندر کی دنیا ہے، جس سے باہر کی دنیا تشکیل پاتی ہے۔ اسی لیے کارکن کی کارکنیت کے عمل کا آغاز اس اندر کی دنیا سے ہونا چاہیے۔ یہ مرکز قلب ہے۔ قلب کے معنی محض اس پمپ کے نہیں ہیں، جو رگوں میں ہر لمحے خون کو گردش میں لاتا ہے۔ بلکہ قلب وہ ہے، جو زندگی کے اندر جذبات، محرکات، عزائم اور مقاصد کو پروان چڑھاتا ہے اور جیسی چیز اور جنس وہاں سے جنم لے گی، اس کے اثرات لازماً پوری زندگی پر پڑیں گے۔ اسی لیے انبیائے کرام علیہ السلام نے ہمیشہ تبدیلی کے عمل کا آغاز یہیں سے کیا اور اسی پر قائم رہے اور آخری وقت تک اسی کی دعوت دیتے رہے۔

نبی کریمﷺ نے ایک حدیث میں اسی پہلو پر بڑا زور دیتے ہوئے فرمایا کہ انسانی جسم میں ایک گوشت کا لوتھڑا ہے۔ اگر یہ سدھر جائے تو ساری زندگی سدھر جائے گی، اور اگر یہ بگڑ جائے تو ساری زندگی بگڑ جائے گی۔ اگر اس میں فساد ہو تو پورا جسم جو ظاہری ہاتھ پاؤں ہیں فساد کا شکار ہو جائیں گے اور متاثر ہوں گے۔ گویا انسان کے ظاہری اعمال، افعال، تہذیب، سوسائٹی اور معاشرہ، سب میں فساد پیدا ہوگا۔ اگر اس میں اصلاح ہو جائے اور صالحیت پیدا ہو جائے تو پھر اخلاق و اعمال، افعال و اقوال، تہذیب و تمدن اور سوسائٹی، سب کی اصلاح ہو جائے گی۔ پھر آپﷺ نے فرمایا: اچھی طرح سن لو کہ یہ دل ہے۔

قلبِ سلیم

قرآن مجید نے بھی اس بات کو بار بار واضح کیا ہے۔ ایک طرف تو یہ بات واضح کی ہے کہ آخرت میں نجات اور کامیابی کا انحصار قلب پر ہے:

اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ ○ (الشعراء:۸۹)

''وہ شخص اللہ کے غضب سے نجات پائے گا جو قلب سلیم لے کر آئے گا۔''

دوسری جگہ فرمایا کہ دیکھو جنت قریب آگئی ہے اور متقیوں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ اس کی بشارت ان لوگوں کے لیے ہے جو بار بار اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں اور جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں:

ھٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِکُلِّ اَوَّابٍ حَفِیْظٍ ○ مَنْ خَشِیَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَیْبِ وَ جَاءَ بِقَلْبٍ مُّنِیْبٍ ○ (قٓ:۳۲،۳۳)

''یہ ہے وہ چیز، جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا، ہر اس شخص کے لیے، جو بہت رجوع کرنے والا اور بڑی نگہداشت کرنے والا تھا، جو بے دیکھے رحمٰن سے ڈرتا تھا اور جو دلِ گرویدہ لیے ہوئے آیا ہے۔''

بار بار لوٹنا بھی قلب کی صفت ہے کہ آدمی بار بار نیچے گرتا ہے پھر اٹھ کر کھڑا ہوتا ہے۔ پیچھے ہٹتا ہے، پھر آگے بڑھتا ہے اور بار بار لوٹ کر آتا ہے۔ یہ قلب کے عزم اور ارادے کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

دوسری صفت خشیت ہے۔ خشیت بھی قلب کا وظیفۂ خیر ہے۔ جسم کپکپائے، رونگٹے کھڑے ہوں، ہاتھ پاؤں نرم پڑ جائیں، یہ سب ظاہر کی چیزیں ہیں لیکن خشیت کا مسکن اور گھر وہی دل ہے۔

تیسری صفت، قلب سلیم ہے۔ اس آیت کے آخر میں یہ فرما کر تو بات بالکل واضح کر دی کہ جو ایک اللہ کی طرف رجوع کرنے والا دل لے کر آیا، وہی اس جنت کا مستحق ٹھیرے گا۔ وہی صحیح معنوں میں متقی ہے۔ اسی کے لیے جنت کی بشارت ہے۔ یہ بات صرف آخرت ہی کی بات نہیں ہے بلکہ دنیا کے معاملے میں بھی اس بات کو واضح کیا گیا ہے:

فَاِنَّهَا لَا تَعۡمَى الۡاَبۡصَارُ وَلٰـكِنۡ تَعۡمَى الۡقُلُوۡبُ الَّتِىۡ فِى الصُّدُوۡرِ ۝ (الحج:۴۶)

''حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں مگر وہ دل اندھے ہوجاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔''

گویا آنکھیں دیکھتی رہتی ہیں، دماغ سوچتے رہتے ہیں، کان سنتے رہتے ہیں لیکن دل اندھا ہو جاتا ہے۔ دل سننے سے انکار کر دیتا ہے۔ دل کا سوچنا سمجھنا ختم ہو جاتا ہے۔ بہ ظاہر انسان کی ہر چیز اپنی جگہ ہوتی ہے، زندگی کا معمول بھی ہوتا ہے، دفاتر بھی ہوتے ہیں، تحریکی سرکلر بھی ہوتے ہیں، اجتماعات بھی ہوتے ہیں، اس کی بھاگ دوڑ بھی ہوتی ہے، تگ ودو بھی جاری ہوتی ہے، لیکن اصل دنیا، یعنی دل سے رابطہ ختم ہو جاتا ہے۔

اس آیت میں جہاں مرض کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، وہاں یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ مرض کا سرچشمہ بھی دل ہے۔ فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ (ان کے دلوں میں مرض ہے) چناں چہ باہر جو کچھ بھی پیش آرہا ہے، اس سب کا سرچشمہ اگر کوئی ہے تو وہ دل ہے۔ لہٰذا زندگی کی جو بھی ظاہری خرابیاں ہیں، ان سب کا سرچشمہ اور منبع اگر تلاش کرنا ہے تو اپنے دل کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ اسی طرح اگر کسی کو عام کارکن بھی بننا ہے تو اس کو اس سے مفر نہیں کہ وہ اپنے اندر کی دنیا کی طرف توجہ دے، اس کی فکر کرے اور اس کے اوپر کام کرے اور اس کے ساتھ ساتھ باہر کی دنیا کی بھی فکر کرے۔ دل سدھرے گا تو جسد سدھرے گا اور اس طرح ساری زندگی سدھر جائے گی۔ ہمیں شکایت رہتی ہے کہ لوگ وقت پر اجتماع میں نہیں آتے، روایات ٹوٹ رہی ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟ ہمیں فکر ہے کہ لوگ برسوں سے متفق ہیں اور آگے نہیں بڑھتے، اس کی کیا وجہ ہے؟ ہم آپس میں تذکرہ کرتے ہیں کہ مسجدوں میں لوگ نماز کے لیے حاضر نہیں ہوتے، اس کی کیا وجہ ہے؟ اگر غور کیا جائے تو ان سب کی بنیادی وجہ نہ تقریروں کی کمی ہے نہ لٹریچر کی اور نہ تلقین و وعظ کی بلکہ دراصل کمی اس بات کی ہے کہ ہم خود اپنے اندر کی دنیا سے غافل ہیں۔

فَاَنۡسٰهُمۡ اَنۡفُسَهُمۡ ؕ (الحشر:۱۹)

''تو اللہ نے انھیں اپنا نفس بھلا دیا۔''

اگر ہم کبھی اس مقام پر پہنچ جائیں، خدا کا فضل ہے کہ ابھی نہیں پہنچے، لیکن اس سے ہوشیار رہنا ضروری ہے، پھر ہم اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں۔ جب ہم اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں تو پھر اپنے مقصد کو، اپنی کارکنیت کو، اپنے نصب العین کو اور اپنے کام کو کیسے یاد رکھ سکتے ہیں؟

اصلاحِ قلب

اگر ہم ڈوری کے اس سرے کو مضبوطی سے پکڑ لیں اور یہاں سے اپنے کام کا آغاز کریں اور اختتام بھی اور ہمیشہ اس پہلو کو پیش نظر رکھیں تو پھر ہمارے سامنے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کی اصلاح کیسے ہو اور اس کی طرف توجہ کیسے کریں؟

اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو تو یہ ہے کہ دل ہمارے اندر کے جذبات، محرکات، عزائم اور مقاصد کا مسکن ہے اور جیسے عزائم و مقاصد اور جذبات و محرکات اور خواہشیں وہاں بسیرا کریں گی اور ڈیرا ڈالیں گی ویسی ہی ہمارے دل کی دنیا بنے گی۔ لہٰذا کچھ تو وہ چیزیں ہیں، جنھیں ہم کو وہاں بٹھانے اور مضبوطی کے ساتھ جمانے کی کوشش کرنی ہے اور کچھ اس کے ذرائع ہیں۔

میں آج کی گفتگو میں ذرائع پر تو بات نہیں کروں گا، لیکن ان چند بنیادی باتوں کا ذکر ضرور کروں گا، جن کی طرف توجہ کی ضرورت ہے۔

ساری زندگی کا سودا

پہلی بات یہ کہ اپنے دل کو اس بات پر مطمئن کرنا ہے کہ یہ ساری زندگی کا سودا ہے، جو ہم نے تحریک میں آکر کیا۔ اس لیے کہ ایمان کے معنی ہی ساری زندگی کے سودے کے ہیں۔ اہلِ ایمان تو وہ ہیں، جو اپنے آپ کو اللہ کی رضا کی تلاش میں فروخت کر دیتے ہیں۔ اس چیز کو بار بار دل میں بٹھانے، اس کی تذکیر کرنے اور اس کا وعظ دل کو سنانے کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ دل کی عادت یہ ہے کہ کسی چیز کو سن بھی لیتا ہے، سمجھ بھی لیتا ہے، اختیار بھی کر لیتا ہے، مگر اُس سے بہت جلد غافل بھی ہو جاتا ہے۔ غفلت کا علاج یہ ہے کہ ہم اس کو بار بار یاد دِلائیں۔ اسی لیے قرآن بھی ذکر ہے اور اسی لیے تذکیر کا حکم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ذکر کی اہمیت کو قرآن و حدیث کی تعلیمات میں اجاگر کیا گیا ہے۔

پوری زندگی کا سودا ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ہم زندگی کے حصے بخرے یا خانے (کمپارٹمنٹ) نہیں کر سکتے کہ یہ تحریک کا کمپارٹمنٹ ہے، یہ دنیا کمانے کا کمپارٹمنٹ ہے اور یہ کیریر کا کمپارٹمنٹ ہے اور یہ بیوی بچوں کا کمپارٹمنٹ ہے۔ بلکہ سارے کمپارٹمنٹ ایک ہی ہستی کے لیے ہیں اور وہ اللہ ہے۔ اس کے یہ معنی بھی نہیں ہیں کہ کوئی دوسرا کام نہیں ہوگا اور ہم سب کام چھوڑ کر صرف تحریک ہی کا کام کریں۔ اس کے اصل معنی یہ ہیں کہ تحریک کا اصل مقصد اور نصب العین ہی غالب ہوگا اور ہر جگہ جاری و ساری بھی۔ اگر ایک شخص پوری زندگی کا سودا اپنے رب سے کرلے تو ظاہر بات ہے کہ وہ شوہر کی حیثیت سے یا بیٹے کی حیثیت سے یا بیوی کی حیثیت سے یا تاجر کی حیثیت سے یا ملازم کی حیثیت سے، جہاں بھی ہوگا اسی سودے کے تحت ہوگا اور جو کام بھی کرے گا اسی سودے کے ماتحت کرے گا۔ اس کا ہر شغل اسی نصب العین اور مقصد سے متعین ہوگا۔ پھر یہ کوئی پارٹ ٹائم کام نہیں بلکہ کل وقتی کام ہے۔ اس لیے اس میں پوری زندگی لگانا ہوگی۔

آپ اس بات کو بھی سمجھ لیں کہ پارٹ ٹائم اور فل ٹائم کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آدمی صرف اسی کام کے اندر پورا وقت اور پوری زندگی لگا دے، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ جس وقت، جس حیثیت میں، جہاں بھی ہوگا اور جو لمحہ بھی گزار رہا ہوگا وہ صرف اسی کام کے لیے ہوگا اور اسی کے لیے صرف کرے گا۔ یہ بات ہمیشہ اس کے پیش نظر رہے گی کہ وہ اپنی زندگی کا سودا اپنے رب سے کر چکا ہے۔ اس کی قیمت وہ وصول کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس کے بارے میں وہ مخلص ہے۔ اُس کا عزم سچا ہے اور اسی کے لیے وہ اپنا وقت لگائے گا۔

زندگی کا سودا، کس قیمت پر!

اس میں سمجھنے کی بات یہ ہے کہ وہ کیا قیمت ہے، جس کے لیے ہم نے اپنی زندگی کا سودا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ تو یہ فرمایا: اِبْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰہِ (البقرۃ:۲۰۷) یہ اللہ کی رضا کی تلاش ہے، جس کے لیے ایک مومن اپنے آپ کو فروخت کر دیتا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَ اَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ (التوبۃ:۱۱۱)

''حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے
خرید لیے ہیں۔''

اگر ان دونوں آیتوں کو ملا کر پڑھیں تو یہ بات بالکل صاف اور واضح ہے کہ اللہ کی مرضی کی تعبیر جنت ہے، جس کا ذکر اس نے بڑی تفصیل کے ساتھ قرآن مجید میں کیا ہے۔ اب یہاں یہ بات کہنے میں بھی کوئی حرج نہیں کہ ساری زندگی کا سودا دراصل ایمان ہی کی ایک تعبیر ہے۔ قرآن مجید میں ایمان کے معنیٰ کچھ عقائد کا زبان اور اعضا سے اقرار ہے، جیسا کہ بعد میں ہمارے متکلمین نے اس کی تعبیر کی ہے۔ بلکہ قرآن مجید میں ایمان کی تعبیر ایک پورے معاہدے اور تجارت کی ہے، جو آدمی اللہ کے ساتھ کرتا ہے۔ ایمان دراصل اس چیز کا نام ہے کہ آدمی ہر لمحے، ہر وقت اور ہر فعل میں اور زندگی کے ہر کام میں صرف اپنے رب کی مرضی پوری کرنے میں لگ جائے۔ عقائد، ان کا فلسفہ اور ان کے دلائل اور اس کا بیان، یہ بعد کی چیز ہے۔

عرب کے بدو، بکریاں اور بھیڑیں چرانے والے، مکے کے معمولی اور بڑے تاجر، جنھوں نے اس دعوت پر لبیک کہا وہ ایمان اور عقائد کے فلسفوں سے واقف نہیں تھے۔ لیکن ایمان کی حقیقت سے ضرور واقف تھے۔ انھوں نے اپنا سب کچھ لگا کر اپنی زندگی کا سودا اپنے رب سے کیا اور جب اس راہ پر کھڑے ہوئے تو بغیر بڑے بڑے فلسفوں کے وہ اس لائق ہو سکے کہ ساری دنیا کو تسخیر کر سکیں۔ یہ وہ چیز ہے کہ نگاہیں اس چیز پر جم جائیں۔ جو چیز اس کے بدلے میں ملنے والی ہے، اس کی قدر و قیمت کا احساس ہو۔ اس چیز کی صاف اور سیدھی تعبیر جنت کے لفظ سے قرآن مجید میں کی گئی ہے۔ تحریکِ اسلامی کے عام کارکن کو چاہیے کہ وہ اپنے دل کی گہرائیوں میں، اپنی زبان پر اور اپنے عزائم میں، اپنی نگاہیں اسی جنت پر جما دے۔

آخر کیا وجہ ہے کہ جس قرآن سے اور جن احادیث سے ہم اقامت دین کا استدلال کرتے ہیں، شہادت حق کے لیے حدیثیں لاتے ہیں، حکومت الٰہیہ کے قیام کے لیے دلائل پیش کرتے ہیں، اسی قرآن کا بڑا حصہ اُس جنت کے بیان کے لیے وقف ہے، جس کا وعدہ مومنین سے کیا گیا ہے، جس کی بشارت ان کو دی گئی ہے۔ وہاں کیسی نہریں بہتی ہیں، وہاں کیسے کنگن پہنائے جائیں گے، وہاں کیسے جام پینے کو ملیں گے، یہ ساری چیزیں اسی قرآن مجید کے اندر موجود

ہیں، جس کو ہم پڑھتے بھی ہیں، پڑھاتے بھی ہیں اور جس کی طرف پوری قوم کو دعوت دیتے ہیں۔ دراصل یہ فرد کی وہ منزل ہے، جس پر اس کی نگاہیں جم جانا چاہئیں۔ اگر اس منزل پر آپ کی نگاہیں جم گئیں، تو پھر آپ کے لیے وہ منزل بھی آسان ہوگی، جس تک اس دنیا میں آپ پہنچنا چاہتے ہیں: وَ اُخْرٰی تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَتْحٌ قَرِیْبٌ (الصف:۱۳)۔ یعنی وہ دوسری چیز، جس کو تم پسند کرتے ہو، چاہتے ہو کہ تم کو ملے، وہ بھی تمھیں دے گا۔ ''اللہ کی طرف سے نصرت اور قریب ہی میں حاصل ہو جانے والی فتح''، لیکن یہ تمھاری تجارت کا اصل سودا نہیں ہے۔ یہ اس کی اصل قیمت نہیں ہے۔ درحقیقت جس تجارت کی تم کو دعوت دی گئی ہے، جو تجارت تم نے کی ہے وہ تو وہ تجارت ہے، جو عذاب الیم سے نجات دے اور جنت کی طرف لے کر جائے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰی تِجَارَةٍ تُنْجِیْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ○ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ○ (الصّف:۱۰،۱۱)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو، میں بتاؤں تم کو وہ تجارت، جو تمھیں عذاب الیم سے بچادے۔ ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے۔ یہی تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔''

میں آپ سے کہتا ہوں کہ اگر اس جنت ابدی کے آپ طلب گار بن جائیں تو جنت ارضی کے دروازے بھی آپ کے لیے کھل جائیں گے۔

عرب کے بدو اور بکریاں چرانے والے جنت ابدی کے طلب گار بن گئے تھے، اسی کے لیے جی اور مر رہے تھے، اسی لیے اللہ نے ان کے لیے اسپین سے لے کر دریائے سندھ کے ساحل تک ساری دنیا کو مسخر کر دیا اور جنت ارضی اُن کے حوالے کر دی۔ یہ اس کا وعدہ ہے، جو اس نے بالکل صاف اور واضح کیا ہے کہ جس کی جانچ ہو جائے کہ جینے والے اس کے لیے جی رہے ہیں، اس کی رضا کی طلب کے لیے جی رہے ہیں، اس کی جنت کے لیے جی رہے ہیں، تو اس دنیا

کی جنت بھی ان کے حوالے کردی جائے گی۔اس لیے کہ زمین کی وراثت انھی کو ملتی ہے، جو صالح ہوں۔اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ ضرور پورا ہو کر رہے گا۔

قدر و قیمت کا احساس

اس بارے میں جو بات سمجھنا اور جاننا چاہیے، وہ یہ ہے کہ اللہ سے اس سودے اور جنت کی قدر و قیمت کا احساس ضروری ہے۔اگر قیمت کے بارے میں آدمی یہ سمجھے کہ دو ٹکے کی چیز ہے کہ جو ہمیں مل رہی ہے تو پھر آدمی نہ سرگرم ہوسکتا ہے، نہ راہِ خدا میں نکل سکتا ہے اور نہ اپنا سب کچھ لا کر قربان کرسکتا ہے۔قرآن نے تو نفس اور مال دونوں کا مطالبہ کیا ہے۔عام طور پر ہم نفس کا ترجمہ جان سے کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ ہم جان دے دیں اور مال خرچ کریں۔درحقیقت نفس کے معنیٰ اس سانس کے ہیں، جو آتی جاتی ہے۔جان دینا اگرچہ مشکل کام ہے لیکن جذبات کی رو میں آسان ہوسکتا ہے۔مگر اپنی پوری زندگی، پوری شخصیت اور پوری ذات کو اللہ کے حوالے کردینا زیادہ مشکل کام ہے۔قرآن کا مطالبہ یہی ہے کہ کارکن جو بھی ہو، مومن، مجاہد یا مہاجر، اپنے نفس اور اپنے مال دونوں کو اللہ کی راہ میں لگادے۔لیکن اصل بات یہ ہے کہ ہمیں اس بات کا پورا یقین ہو کہ اس کی جو قیمت ہمیں ملنے والی ہے، اس قیمت پر ہمارے دل راضی ہوگئے ہیں۔یہ قیمت انمول ہے اور یہاں کی کوئی چیز اس کے مقابلے کی نہیں ہوسکتی۔جنت کی طلب کا بڑا گہرا تعلق دل کی اصلاح سے ہوتا ہے۔دل کو قبلہ ملتا ہے اور دل کے اندر وہ شادابی اور تازگی آتی ہے، جس کا وعدہ جنت کے ساتھ کیا گیا ہے اور جس کا تعلق اللہ کی محبت سے ہے۔

اللہ سے محبت کا تقاضا

محبت کا لفظ سن کر یہ نہ سمجھئے کہ یہ صرف بڑے، معیاری اور مثالی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر مومن کی صفت ہی یہ بیان کی ہے کہ وہ سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت کرتا ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۭ (البقرۃ:۱۶۵)

”ایمان رکھنے والے لوگ سب سے بڑھ کر اللہ کو محبوب رکھتے ہیں۔“

محبت کی کوئی تعریف ممکن نہیں ہے۔اگر کوئی پوچھے کہ رنگ کی کیا تعریف ہے، یا خوشبو

کیسی ہوتی ہے تو اسے الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ رنگ کا تعلق دیکھنے سے ہوتا ہے، ذائقے کا چکھنے سے اور خوشبو کا سونگھنے سے۔ یہ اپنے تجربے کی چیز ہے اور ہم میں سے ہر ایک کو اس کا تجربہ ہے۔ اگر مال سے محبت ہو تو اس کے لیے ہم کیسے سرگرداں رہتے ہیں، کیسے اس کی فکر ہمارے اوپر غالب رہتی ہے، اس کے لیے کیسے ہم دن رات ایک کرتے ہیں اور صبح سے شام تک کس طرح اپنے آپ کو لگاتے ہیں، اس کا ہم میں سے ہر شخص کو بہ خوبی اندازہ ہے۔ بچوں سے محبت ہو جائے تو ان کے لیے ہم کیسے بے چین ہوتے ہیں۔ غرض ہم میں سے کوئی ہے، جسے زندگی میں محبت کا تجربہ نہ ہو۔ ہر ایک جانتا ہے کہ محبت کیا ہے، اس کی علامات کیا ہیں اور اس کے اثرات کیا ہیں۔ زندگی کے اندر انھیں محسوس کیا جا سکتا ہے۔

ایمان کوئی قانونی معاہدہ نہیں ہے، جو لکھ کر لیا گیا ہے، بلکہ یہ دل کا سودا ہے اور محبت کا سودا ہے۔ اللہ نے صاف کہا ہے کہ یہ ایمان کی نشانی ہے کہ آدمی سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت کرے۔ اللہ کے رسول نے بھی صاف کہا ہے کہ ''جب تک میں تم کو اپنی جان، اپنے مال اور ہر چیز سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں، تم مومن نہیں ہو سکتے۔'' یہ ایمان کی علامت ہے، جو تمھارے اندر ہونی چاہیے۔ اس کے بعد اس میں کیا شک کی گنجایش ہے کہ جب تک یہ غالب ترین محبت دل میں نہیں ہوگی، اس وقت تک دل کی دنیا درست نہیں ہوگی اور جب تک دل کی دنیا درست نہیں ہوگی، باہر کی دنیا بھی درست ہونا مشکل ہے۔

محبت کی نشانیاں، صاف اور واضح ہیں۔ ان کو آپ بڑی آسانی کے ساتھ دیکھ بھی سکتے ہیں، جانچ بھی سکتے اور پرکھ بھی سکتے ہیں۔ اپنے اوپر غور کر لیجیے۔ اپنے افعال پر، اقوال پر، زندگی پر، نماز پر، ہر چیز پر غور کر لیجیے، آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ آپ کو اللہ سے کتنی محبت ہے۔ محبت ہوگی تو ایمان کے اندر حلاوت اور مٹھاس ہوگی۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ اگر دل کے ٹکڑے کر کے ایک حصہ اللہ کو دے دیا جائے اور باقی حصے دوسروں کو تو وہ اسے قبول نہیں۔ قرآن مجید میں ایک جگہ ذکر کیا گیا ہے کہ بعض لوگ جانور ذبح کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ حصہ خدا کے لیے اور یہ حصہ ان کے لیے، جنھیں انھوں نے خدا کا شریک بنا رکھا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو حصہ اللہ کے لیے ہے وہ بھی ان کو پہنچتا ہے، جنھیں انھوں نے شریک بنا رکھا ہے۔ وہ اللہ کو نہیں

پہنچتا اور نہ اللہ اسے قبول کرتا ہے۔ اس لیے کہ اسے پورا دل چاہیے اور اگر یہ اس کے حوالے کر دیا جائے تو اس کا ذمہ ہے۔

اَلَیْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ ؕ (الزمر:۳۶)

''کیا اللہ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے؟''

جب آدمی اپنے سودے کی، جو چیز اس نے طے کی ہے وہ اُس کی اپنی طرف سے راہِ خدا میں کھپا دے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ خالق، جس سے بڑھ کر سچا کوئی نہیں:

وَ مَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِیْثًا ۝ (النساء:۸۷)

''اللہ کی بات سے بڑھ کر سچی بات اور کس کی ہو سکتی ہے۔''

اپنی طرف سے قیمت ادا نہ کرے اور اسے ہم تک نہ پہنچائے۔

یہ وہ چیز ہے، جو ہمارے بالکل سامنے ہے۔ اگر ہم اس پر غور کریں تو یہ بات بہ خوبی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ اصل وجہ یہ ہے کہ دل کے اندر، جو دوسری محبتیں ہیں وہ اللہ اور اللہ کے دین کے لیے مساوی ہیں یا اس سے زیادہ ہیں، جس کا اقرار و اظہار ہم اپنی گفتگو سے، اپنی تقریروں یا اپنی تحریروں سے کرتے ہیں۔ ورنہ کیا وجہ ہے کہ آپ ایک آدمی سے کہیں کہ فلاں کاروبار بہت منافع بخش ہے، اگر تم وہ پلاٹ آج خرید لو تو کل یہ دوگنا ہو جائے گا اور وہ کوئی اقدام نہ کرے۔ وہ اٹھے گا، کسی طرح روپے جمع کرے گا، خواہ بنک سے قرض لے اور لا کر دے دے گا تا کہ کل دوگنا ہو جائے گا۔ اگر اس سے کہا جائے کہ تم، جو آج دے رہے ہو یہ آنکھ بند کرتے ہی تم کو ۷۰۰ گنا کم از کم ضرور ملے گا اور اس سے زیادہ بھی مل سکتا ہے، تو کیا وجہ ہے کہ اس کی جیب نہ کھلے اور اس کا ہاتھ جیب تک نہ جائے اور وہ بنک بیلنس پر سانپ بن کر بیٹھا رہے؟ اس کی اس کے علاوہ آخر کیا توجیہہ ہو سکتی ہے کہ اس کو اس وعدے پر جو ۷۰۰ گنا کا ہے، یقین نہیں ہے۔ اگر یقین ہے تو اس چیز پر، جو کل یہاں اس دنیا میں ملنے والی ہے۔

غفلت کا سبب

یہی وجہ ہے کہ وہ دعوت کے لیے نہیں نکلتا۔ وہ دیکھتا ہے کہ اس کے رب کا کلمہ دنیا کے

اندر غالب نہیں، اس کے ساتھ لگن اور تعلق کے دعوے بھی کرتا ہے لیکن اس کے اندر اضطراب اور بے چینی پیدا نہیں ہوتی۔ چوں کہ زندگی حصوں، بخروں اور مختلف خانوں میں تقسیم ہے اور وہ محبتیں بھی غالب ہیں، جو اللہ کے علاوہ کسی اور کی ہیں اور اس قیمت پر یقین نہیں ہے، جس کا وعدہ اللہ نے کیا ہے، اس لیے یہ ساری خرابیاں باہر پیدا ہوتی ہیں۔

میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ پہلے آدمی صوفیا کی طرح دل کی دنیا صاف کرنے، دل کو رگڑنے اور مانجھنے کے اوپر لگ جائے اور جب وہ صاف ہو جائے تو پھر تحریک کے کام کے لیے نکلے، بلکہ یہ تو ایک ایسا عمل ہے، جو ایک دوسرے کے ساتھ باہم پیوست اور جڑا ہوا ہے۔ دل کو درست کرنے کا طریقہ ہی یہ ہے کہ آدمی تحریک کے کام اور جہاد کے لیے نکل کھڑا ہو اور اس کام کو بھی ساتھ ساتھ کرے۔ ایک طرف تو وہ اللہ کے وعدے پر یقین رکھے اور اپنی زندگی کے سودے پر یقین کرے اور اس بات کا احساس کرے کہ میں اپنا سب کچھ خدا کے ہاتھ فروخت کر چکا ہوں۔ اب میرا کچھ نہیں ہے، جو میں اپنے پاس رکھ سکتا ہوں۔

یہ بات ہمیں خطبات (مولانا مودودیؒ) کے اندر بہت شروع میں بتائی گئی تھی کہ ایمان لانے کے بعد آدمی نہیں کہہ سکتا کہ یہ ہاتھ میرا ہے، یہ پاؤں میرا ہے، یہ مکان میرا ہے اور یہ مال میرا ہے۔ اس میں سے کچھ بھی اس کا نہیں ہے۔ ایمان لانے کے بعد وہ اس میں سے ہر چیز اپنے مالک، اپنے خالق اور اپنے رب کے ہاتھ بیچ چکا ہے۔ یہ بالکل ابتدائی سبق ہے، جس کو پڑھ کر ہم سب اس تحریک کے اندر آئے ہیں۔ انسان کی فطرت میں غفلت کا خمیر گوندھ دیا گیا ہے۔ ہم بار بار اس کو بھول جاتے ہیں۔ اس کا علاج ذکر، تذکیر اور اپنے آپ کو یاد دلانے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ یہی کام نبی کریم ﷺ بھی کرتے رہے اور یہی کام ہم سب کو کرنا ہے۔

درحقیقت یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ یہ کام اگر ہم نے کیا اور اپنے آپ کو اسی قیمت پر تیار کر لیا، جس کا ذکر میں نے کیا ہے، تو پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم ہر وقت پورے عزم اور حوصلے کے ساتھ، سرسبز و شاداب، سدا بہار ایمان اور جذبے کے ساتھ اس کام میں نہ لگے رہیں۔ کوئی خارجی چیز، کوئی باہر کی تبدیلی، ہمارے اندر کی دنیا کو بدل نہیں سکتی۔ اندر کی دنیا میں تو اتنی طاقت ہو سکتی ہے کہ وہ باہر کی دنیا کو بدل دے، مگر باہر کی چیزیں اندر کی دنیا نہیں بدل سکتیں۔ قرآن مجید میں

جب بھی مرض کی تشخیص کی گئی تو یہی کی گئی کہ دل کی دنیا بدل چکی ہے، نگاہیں کسی اور چیز پر جمی ہوئی ہیں، اپنے ساتھیوں سے، اپنی تحریک سے اور اپنے نصب العین سے ہٹ گئی ہیں۔

آخرت پر نظر

قرآن کے مطابق:

مِنۡکُمۡ مَّنۡ یُّرِیۡدُ الدُّنۡیَا وَ مِنۡکُمۡ مَّنۡ یُّرِیۡدُ الۡاٰخِرَۃَ (آل عمران:۱۵۲)

''تم میں سے بعض وہ ہیں، جو دنیا چاہتے ہیں، اور تم میں سے بعض وہ ہیں، جو آخرت چاہتے ہیں۔''

یہ بات قرآن نے اس جماعت کے بارے میں کہی تھی اور صاف الفاظ میں کہی تھی، جو مثالی جماعت تھی۔ پھر فرمایا کہ جو آخرت کے چاہنے والے ہیں، انھی کا نصیب اور انھی کا حصہ دنیا کی کامیابی بھی ہے اور جب لوگوں سے کہا گیا کہ اللہ کی راہ میں نکلو مگر لوگوں نے نکلنے سے گریز کیا تو اس پر فرمایا:

اَرَضِیۡتُمۡ بِالۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا مِنَ الۡاٰخِرَۃِ (التوبة:۳۸)

''کیا تم نے آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی کو پسند کر لیا؟''

گویا مرض کی جڑ تقریروں کی کمی نہیں، تربیت گاہوں کی کمی نہیں، بلکہ مرض کی جڑ دراصل یہ ہے کہ آدمی کس چیز پر راضی ہے۔ وہ اپنی زندگی کی، اپنی کوششوں کی اور اپنے مفادات اور اپنی محنت کی کیا قیمت لینا چاہتا ہے۔ اگر وہ یہ قیمت دنیا میں لینا چاہتا ہے تو قرآن میں صاف کہا گیا ہے کہ اگر تم آخرت کا ارادہ کرو اور اس کے لیے کوشش کرو اور ایمان اور یقین کے ساتھ کوشش کرو تو وہ تم کو مل کر رہے گی، لیکن اگر دنیا کے لیے کرو گے تو ہم جس کو جتنا چاہتے ہیں دیتے ہیں۔ ضروری نہیں ہے کہ آپ جتنا چاہیں اتنا آپ کو مل جائے۔ لہٰذا آخرت پر نظر رہنی چاہیے۔ دل کے اندر یہی سودا سمایا ہونا چاہیے۔ اس کا خیال ہونا چاہیے۔ اسی کی محبت سب محبتوں پر غالب ہونی چاہیے اور دل کی لگن اور عشق اسی نصب العین کے ساتھ وابستہ ہونا چاہیے۔

تربیت کا اہم ذریعہ

اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم کسی گوشے میں بیٹھ کر دل میں اس محبت کو اجاگر کر سکتے ہیں۔ وہ محبت جو صرف (صرف کا لفظ بہت اہمیت کے ساتھ بول رہا ہوں) گوشوں میں بیٹھ کر اور اللہ کو یاد کر کے حاصل ہوتی ہے وہ کسی کام کی نہیں۔ اگر اللہ کو یہی محبت مطلوب ہوتی تو اس کے لیے فرشتے اس کے چاروں طرف موجود ہیں۔ ذکر بھی کرتے ہیں، اس کی تسبیح بھی کرتے ہیں، اس کی تقدیس بھی کرتے ہیں اور اس کے ساتھ محبت بھی کرتے ہیں۔ مگر اس کو تو دراصل وہ بندے مطلوب ہیں، جو باہر نکل کر، اپنے دل کی دنیا کو آباد کر کے، اس کے ذریعے ساری دنیا کو آباد کریں۔ اس لیے وہ دوسرا کام، جس کے ذریعے دل کی دنیا بھی بنتی ہے اور جو تحریک کے کارکن کی صفت ہونا چاہیے، وہ دعوت کا کام ہے۔

دعوت اور تحریک

یہ تحریک دراصل برپا ہی اس لیے ہوئی ہے اور اس کی کامیابی کا راز اس بات میں مضمر ہے کہ وہ اس فریضے کو ادا کرے، جو اللہ کے رسولوں کے ذمے تھا۔ وہ فریضہ یہ تھا کہ ایک ایک محلے میں، ایک ایک فرد کے سامنے اللہ کے دین کی دعوت پیش کی جائے اور اس کا گواہ بن کر کھڑا ہوا جائے۔ قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ ہم نے تم کو مبشّر (بشارت دینے والا)، نذیر (ڈرانے والا) اور اس کے ساتھ داعیاً الی اللّٰہ (اللہ کی طرف بلانے والا) بنا کر بھیجا ہے۔ یہ رسالت کی پوری تعبیر اور تفسیر ہے، جو ہمارے سامنے موجود ہے۔ اسی پر ہمیں اپنے آپ کو جانچ پرکھ کر دیکھنا ہے، اپنا جائزہ لینا ہے اور سوچنا ہے کہ یہ کام ہم کتنا کر رہے ہیں۔

اس تحریک کا آغاز صرف دعوت سے ہوا تھا۔ افراد جمع ہوئے اور تنظیم بن گئی۔ تنظیم کا بننا ضروری ہے۔ اس لیے کہ صالح جماعت کے بغیر ہم اس منزل کا خواب نہیں دیکھ سکتے، جس کا حصول ہمارے پیش نظر ہے، لیکن صالح جماعت خود کوئی مقصد نہیں ہے۔ دفاتر بذاتِ خود مقصد نہیں ہیں اور نہ اجتماعات ہی مقصد ہیں۔ یہ سب ذریعہ ہیں اس بات کا کہ اللہ کے دین کا پیغام زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچے، انھیں مسخر کر کے اپنے ساتھ لائے، یا کم سے کم وہ اس کا انکار کر دیں۔

میں اپنے چند ذاتی تجربات بتاتا ہوں، جن سے شاید آپ کو صورتِ حال کا اندازہ ہو۔

میں دو سال بھارت میں جنگی قیدیوں کے کیمپ میں رہا۔ کوئی مجھے نہیں جانتا تھا کہ میں جماعت اسلامی کا کارکن یا رکن ہوں یا اُس کا کوئی آدمی ہوں۔ میں دو سال تک اپنے ان ۳۰۰ ساتھیوں کو جو پنجاب، سندھ اور سرحد کے دیہاتوں سے نکل کر آئے تھے، فوج کے سپاہی تھے، کم تعلیم یافتہ تھے، وہی باتیں بتاتا رہا، جو ہماری دعوت کی بنیاد ہیں۔ مجھے یہ سن کر سخت صدمہ ہوتا تھا جب وہ کہتے تھے کہ پاکستان میں تو کوئی جماعت ایسی نہیں، جو یہ باتیں کہتی ہو اور اس کی طرف دعوت دیتی ہو۔ میری دعوت بالکل وہی تھی، جو جماعت اسلامی کی دعوت ہے، سیاست میں بھی اور دین میں بھی بنیادی دعوت بھی اور مفصل دعوت بھی۔ یہ بات آپ کو جاننی چاہیے کہ ان میں سے بھاری اکثریت اس وقت کے فرماں روا کی والہانہ شیدائی تھی۔ اس کے باوجود ان کا کہنا یہ تھا کہ یہ باتیں پاکستان میں کوئی جماعت کہنے والی نہیں۔

جب کبھی وطن واپسی پر میں کراچی آ کر ٹھیرتا ہوں، مسجد جاتا ہوں اور نماز پڑھتا ہوں، یا لاہور آتا ہوں اور مسجد میں نماز پڑھتا ہوں، مگر مجھے کوئی آدمی ایسا نہیں ملتا کہ جو آگے بڑھ کر یہ کہے کہ آپ ہمارے بھائی ہیں۔ یہ چار پانچ یا دس آدمی، ان ۲۰۰ افراد کے اندر موجود ہیں، جو ہمارے ساتھی ہیں، ہمارے کارکن ہیں اور ہمارے لیے کام کرتے ہیں۔

یہ دو نمونے (Sample) میں نے آپ کے سامنے پیش کیے ہیں۔ آپ کہیں گے کہ آپ تو بیرونِ ملک رہتے ہیں، باہر سے آئے ہیں، آپ کا سیمپل محدود ہے۔ بہت ساری مسجدیں ایسی ہیں جہاں ایسے لوگ مل جائیں گے۔ میں آپ سے اختلاف نہیں کروں گا۔ آپ کی بات صحیح ہے۔ لیکن randm sampleing میں یہ ہوتا ہے کہ آدمی کہیں سے بھی کوئی آٹھ دس سیمپل اٹھالے اور اس کے بعد دیکھے کہ کیا صورتِ حال ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ وہ سیمپل ہے، جس سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں۔ آپ اپنے اجتماعات میں بیٹھ کر اندازہ نہ لگائیں۔ کسی بازار میں یا کسی چوراہے پر آپ کھڑے ہو جائیں اور وہاں سے گزرنے والے ۳۰، ۴۰ افراد سے آپ اندازہ کریں کہ کتنے لوگ ہماری دعوت سے واقف ہیں۔ اس کے بعد آپ اس بات کا اندازہ کریں کہ دعوت کا وہ فرض اب آپ پر کتنا عائد ہوتا ہے۔ آپ یہ دیکھیں کہ ہمارے اوقات، ہمارے

وسائل، ہمارے مالی وسائل، ہمارے دفتر کے سارے روابط اور بہت ساری چیزیں، ان میں سے کتنا حصہ اس کام کے لیے صرف ہو رہا ہے کہ ہماری دعوت اللہ کے بندوں تک پہنچے اور وہ اس کی طرف واپس لوٹ آئیں۔

قلب اور دعوت

ایک عام کارکن بننے کے لیے یہ بالکل بنیادی باتیں ہیں، جو میں نے مختصراً آپ کے سامنے بیان کر دی ہیں۔ ایک یہ کہ اپنے دل کی اصلاح اور توجہ، ساری زندگی کا سودا، اللہ سے محبت اور اس قیمت پر دل کا پورا اطمینان، جس کا وعدہ اللہ نے کیا ہے، اور اسی کا مطلوب و مقصود ہونا۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اپنی ساری سرگرمیوں میں سب سے زیادہ اہمیت اس چیز کو دینا کہ ہم اللہ کا کلمہ، اللہ کی بات، اپنی دعوت، اپنا پیغام زیادہ سے زیادہ انسانوں تک پہنچائیں۔ اس لیے کہ یہی نبی کریم ﷺ کا طریقہ تھا۔ آپ ﷺ مکے کی گلیوں میں گھومتے تھے۔ عکاظ کے میلوں میں جاتے تھے۔ آپ ﷺ نے طائف کا سفر اسی غرض سے کیا۔ پہلا موقع ملا تو آپ ﷺ نے اپنے دور کے مختلف بادشاہوں کو خطوط بھیجے۔ رسولوں کے ہم بہت سارے مناصب اور فرائض گنواتے ہیں۔ دراصل رسول وہ ہے، جو پیغامبر ہے، جس کے پاس ایک پیغام ہو اور اس پیغام کو اسے سارے لوگوں تک پہنچانا ہے۔ یہی بنیادی بات ہے۔

ان دو چیزوں پر اگر آپ توجہ مرکوز کر دیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ان میں سے آپ جتنا حاصل کریں گے، اتنا ہی آپ اچھے درجے کے عام کارکن بنتے چلے جائیں گے۔ اس میں آپ جتنا اوپر اٹھیں گے، آپ اس مثالی کارکن سے، اس مومن، مہاجر، مجاہد، متقی و محسن سے قریب ہوتے چلے جائیں گے، جس کا نقشہ قرآن مجید میں کھینچا گیا ہے۔

اپنی گفتگو کے اختتام پر میں قرآن کی وہ آیت پیش کروں گا، جس میں بتایا گیا ہے کہ مثالی انسان یا کارکن کیسا ہوتا ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَ جٰھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَ اَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ط اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ○ (الحجرات:۱۵)

''حقیقت میں تو مومن وہ ہیں، جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لائے۔ پھر انھوں نے شک نہ کیا اور اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا وہی سچے لوگ ہیں۔''

یہاں بھی عجیب طرزِ بیان ہے کہ مومن وہ ہے، جو ایمان لائے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن بس ایک نام ہے اور اس نام کی بھی ایک صفت ہے۔ گویا ایمان دل کی گہرائیوں میں اتر گیا ہو اور اس کے بعد نہ اس میں شک پیدا ہو، نہ وہ جھجکیں، نہ ہچکچائیں، نہ پیچھے ہٹیں، نہ ان پر سستی طاری ہو، نہ کوئی اضطراب کی کیفیت موجود ہو اور وہ اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان لگا دیں۔ اس کے بعد یہ نہیں کہا گیا کہ یہ کسی مثالی کارکن کا نقشہ ہے، بلکہ فرمایا: اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ یہی ہیں، جو ایمان کے وعدے میں سچے ہیں اور کارکنیت کے دعوے میں کھرے ہیں۔

یہ راستہ آپ کے لیے کھلا ہوا ہے۔ یہ بڑا آسان، بڑا سادہ اور بڑا سیدھا راستہ ہے۔ اگر آپ ان دو چیزوں کو مضبوطی سے پکڑ لیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ بڑے اچھے کارکن بن جائیں گے۔ ان شاء اللہ

○○